

مولانا عامر عثمانی

مولانا عامر عثمانی سے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ملاقات ہوئی اور پہلی ملاقات ہی میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے سے قبل بھی دوست تھے۔ دیو بند سے وہ کراچی اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے کئی بار آئے۔ اور اُن سے مسلسل ملاقاتوں کے بعد بھی سیری نہیں ہوئی، تشنگی باقی رہی! مولانا عامر عثمانی اور راقم الحروف کے درمیان نسل، رنگ اور قوم و وطن کا نہیں دین کا رشتہ تھا۔ اس رشتہ سے زیادہ قوی و مستحکم کوئی دوسرا رشتہ نہیں! جو وہ سوچتے اور لکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے خیالات لڑ گئے ہیں اور میرے محسوسات کا توارد ہو گیا ہے۔ افکار و خیالات میں اس قدر ہم آہنگی اور یک رنگی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

مگر یہ دنیا ہے جس میں انتہائی مخلص دوستوں، عزیزوں اور مخلص خیر خواہوں سے بھی اختلاف کے موقعے آجاتے ہیں۔ مشہور ناصبی العقیدہ اہل قلم محمود عباسی کے موقف کی تائید میں جو تحریریں ماہنامہ "تجلی" میں شائع ہوئیں تو مولانا عامر عثمانی کے اس موقف پر راقم الحروف کو حیرت بھی ہوئی اور وجدان نے اذیت بھی محسوس کی۔ میں نے اُن کو کئی خط بھی لکھے اور "فاران" میں بھی عامر عثمانی کی تحریروں پر نقد و احتساب کیا۔ میرے لیے یہ بڑا شدید مرحلہ تھا، ایک طرف گہری دوستی، مخلصانہ روابط اور برادرانہ تعلقات تھے اور دوسری طرف اظہارِ حق کے تقاضے تھے۔ میں سکوت بھی اختیار کر سکتا تھا لیکن دوست کی رو رعایت کے لیے ضمیر کی آواز کو دبانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ راقم الحروف نے وہی بات کہی جو اس کے نزدیک حق تھی۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قبول حق کے لیے اُن کا سینہ کھول دیا، حق اُن پر چڑھتے ہوئے سورج کی طرح واضح ہو گیا۔ عامر عثمانی نے اپنے موقف سے رجوع کر کے محمود عباسی کی کتابوں پر اس قدر مدلل جرح و تنقید کی کہ پڑھنے والے عش عش کرنے لگے! بھارت میں جن نامی گرامی علماء نے مولانا مودودی کی "خلافت و ملوکیت" کو طنز و تنقید کا ہدف بنایا اور مولانا موصوف پر اہانتِ صحابہؓ کا جھوٹا الزام لگایا تھا، اُن کی تحریروں اور کتابوں کے مولانا عامر عثمانی

نے دلیل و برہان کی تیغ براں سے پرخچے اڑا دیے۔ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا محمد میاں کی کتاب "شواہدِ تقدس" کا ماہنامہ "تجلی" میں اس قدر مہارت و بصیرت کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا گیا کہ یہ کتاب (شواہدِ تقدس) شواہدِ جہالت نظر آنے لگی! تنہا اس شخص نے دیوبند میں رہ کر جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے طوفان کا منہ پھیر دیا ہے اور جیشِ تحریکِ اسلامی کے اس اکیلے سپاہی نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے مخالفین و معاندین کی پلٹن کا مقابلہ کیا ہے!

راقم الحروف اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر، آخرت کی جواب دہی کے احساس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے بڑے بڑے علماء دین جن کے علم و فضل کے ڈنکے بج رہے ہیں اُن کی کتابوں اور تحریروں پر خالص علمی اور فقہی انداز میں جب گرفت کی ہے تو مرحوم کی تنقید پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ علماء علم ہی نہیں عقل و بصیرت سے بھی کورے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی کا مطالعہ بحرِ اوقیانوس کی طرح عریض و طویل اور عمیق تھا۔ وہ جوابات لکھتے تھے کتابوں کے حوالوں اور عقلی و فکری دلائل و براہین کے ساتھ لکھتے تھے۔ پھر سونے پر سہاگا زبان و ادب کی چاشنی اور سلاست و رعنائی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، لغت و ادب غرض تمام علوم میں مولانا عامر عثمانی کو قابلِ رشک بصیرت حاصل تھی۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ ایک ایک جزئیہ کی تردید یا تائید میں امہات الکتب کے حوالے پیش کرتے، علمی اور دینی مسائل میں اُن کی گرفت اتنی سخت ہوتی کہ بڑے بڑے جغادری اہلِ قلم پسینہ پسینہ ہو جاتے! انہیں اپنی رائے اور فکر پر، مطالعہ اور استدلال پر پورا اعتماد تھا اس لیے ہر عالم اور مفکر سے بلند و بالا ہو کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے! راقم الحروف ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھتا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا عامر اپنی ذات سے دبستانِ علم و فضل تھے۔

مولانا عامر عثمانی کے فقہی جوابات میں ناول جیسی ادبی دلچسپی اور زبان کی چاشنی ہوتی ہے کیسے کیسے نازک مسائل کی مرحوم نے کس حذاقت و مہارت کے ساتھ گرہ کشائی کی ہے! "مسجد سے میخانے تک" ماہنامہ "تجلی" کا مستقل عنوان تھا۔ اس میں مزاح و ظرافت کا وہ چٹخارہ کہ:

قند ذا لقہ در موجِ کوثر و تسنیم

مزاح و ظرافت کا مقصد لوگوں کی تفریحِ طبع اور ہنسا ہنسانا نہیں بلکہ عبرت و موعظت کا درس

دنیا تھا! ان چٹکیوں اور گدگدیوں میں وہ بڑے کام کی باتیں بیان کر جاتے۔

دارالعلوم دیوبند میں ماہنامہ "تجلی" پر قدغن تھی مگر نہ جانے کتنے طلبہ چھپ چھپا کر "تجلی" کا مطالعہ کرتے! مولانا عامر عثمانی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور اکابر دیوبند کے عقیدت مند تھے مگر لکیر کے فقیر نہ تھے! دیوبند کے متوسلین اپنے اکابر کی عقیدت میں جو غلو کرتے ہیں مولانا عامر اس سے محفوظ تھے اور اپنے بڑوں کی غلطیوں کی تائید اور تاویل نہیں کرتے تھے، اگر دیوبندی حضرات مولانا عامر عثمانی کی روش اختیار کرتے تو دیوبند کی مخالفت میں "زلزلہ" نام کی کتاب وجود میں نہ آتی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عامر عثمانی کے عمِ محترم تھے۔ اُن کے والد حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن قدس سرہٗ حضرت شیخ الہند سے بیعت تھے۔ مگر عامر عثمانی کو پیری مریدی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ "تجلی" میں عجمی تصوف پر وہ خوب کس کر تنقید کرتے رہتے تھے۔ شرک و بدعت کی تردید اور توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت اُن کا سب سے زیادہ محبوب شغل تھا۔ انہوں نے ہزاروں صفحے شرک و بدعت کی تنقیص و تردید میں لکھے ہیں اور مشرکانہ عقائد و رسوم کے ایک ایک جزئیہ پر احتساب کیا ہے، اس میدان میں وہ ہر وقت شمشیر برہنہ رہتے تھے! اُن کے مفاخر و حسنات کا سب سے روشن باب شرک و بدعت کے خلاف قلمی جہاد ہے، جس کا آخرت میں ان شاء اللہ العزیز اجرِ غیر ممنون انہیں ملے گا۔

اس تمام علم و فضل اور ذہانت و بصیرت کے باوجود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتہائی قدر شناس، عقیدت مند اور مداح تھے۔ مولانا مودودیؒ کو وہ امام العصر اور مجتہدِ وقت بلکہ اس دور کا مجدد سمجھتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی مدافعت میں وہ ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتے تھے۔

"فاران" میں کتابوں پر جس انداز میں نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے، یہ انداز کئی رسالوں نے اختیار کیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے۔ مولانا عامر عثمانی نے "تجلی" میں اس انداز کو پوری طرح برقرار رکھا، شعر و ادب اور زبان پر "فاران" کی تنقیدیں "تجلی" کی تنقیدوں سے شاید کچھ نکلتی ہوئی ہوں، مگر علمی مباحث اور کتابوں پر "تجلی" کی تنقیدوں کا جواب نہیں! یہ مولانا عامر عثمانی کا حصہ تھا، جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے راقم الحروف کی اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی

اب سے تقریباً بائیس برس قبل مولانا عامر عثمانی کراچی تشریف لائے تو اُن کی زبان سے اس قسم کی غزلیں:

یہ قدم قدم بلائیں ، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

سُن کر بڑی مسرت ہوئی، پھر اُنہوں نے "تجلّی" میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کی بحر اور انداز پر سیرت النبیؐ کے منظوم واقعات کا سلسلہ شروع کیا، جو خوب تھا اور اُسے پسند کیا گیا! پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ اُن کی شاعری کا شوق بجھ سا گیا، اس پر میں نے اُن کو لکھا کہ شعر کہنا ترک نہ کیجیے، اللہ تعالیٰ نے شعر گوئی کی جو صلاحیت آپ کو دی ہے اُسے کام میں لائیے۔

پاکستان اور ہندوستان کے مابین برسوں سے ڈاک بند رہنے کے بعد جو ڈاک کھلی تو مولانا عامر عثمانی سے مراسلت کا موقع ملا انہوں نے اپنے کئی قطعے بھیجے، اور اپنی شاعری کے بارے میں میری رائے دریافت کی، میں نے انہیں جواب میں لکھا کہ فلاں فلاں مصرعوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ آپ کو بھی "ترقی پسند شاعری" کی برائے نام ہی سہی مگر چھینٹ لگ گئی ہے ایک دو مصرعوں کا تجزیہ بھی میں نے کیا کہ ان میں یہ یہ مقامات محلِ نظر ہیں، میری تنقید و مشورت کا انہوں نے بُرا نہیں مانا۔

عجیب واقعہ ہے کہ یا تو وہ ایک زمانے میں شاعری سے بے تعلق ہو گئے تھے مگر کئی برس سے شعر گوئی کا شغف بڑھ گیا تھا۔ کوئی شک نہیں وہ نغز گو شاعر تھے! کئی مہینے ہوئے میرے پاس اُن کا خط آیا کہ مہینہ بھر صوبہ مدراس کے مختلف شہروں کا سفر کیا، ہر جگہ مشاعرے پڑھے پانڈیچری اور کیرالہ بھی ہو آیا۔ جس دینی مشن کے وہ مبلغ تھے اور اُن کو علم و فضل کا جو بلند مقام حاصل تھا اُس کے دیکھتے ہوئے مولانا عامر عثمانی کی مشاعروں میں مسلسل شرکت اُن کے نیازمندوں کی نگاہ میں قدرے محسوس ہوئی وہ "ماہر القادری" نہیں "مولانا عامر عثمانی" تھے۔

پونا کے جس مشاعرے میں شعر پڑھتے ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس مشاعرے اور ہندوستان کے متعدد شہروں کے مشاعروں کی دعوت راقم الحروف کو ملی تھی۔ اُدھر سے اصرار کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی، خطوط ہی نہیں تار بھی آئے، فون پر بھی بمبئی سے گفتگو ہوئی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بسترِ علالت سے دو خط لکھے کہ خدا کے لیے کسی طرح آجاؤ! مگر میرا جانا نہ ہو سکا! روزنامہ "دعوت" دہلی میں "مولانا عامر عثمانی کے آخری چند دن" کے عنوان سے جناب محمود داؤد (نگینہ) نے ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا (عامر عثمانی) تین روز تک برابر خاموش پڑے رہے ..... پھر آہستہ

آہستہ افاقہ ہونے لگا، آپ نے گھر والوں سے اور ڈاکٹروں سے اپنے بمبئی جانے کے ارادے کا اظہار کیا، ڈاکٹروں نے کہا کہ ہم اتنے طویل سفر کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ کو مسلسل آرام کی ضرورت ہے۔ اس پر مولانا نے کہا اچھا اجازت نہیں دیتے تو بغیر اجازت ہی چلا جاؤں گا۔ گھر کے لوگوں نے جب آپ کو اس سفر سے باز رکھنا چاہا تو آپ نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا میں وہاں ضرور جاؤں گا، میرا بچپن[1] کا دوست ماہر القادری آرہا ہے اس سے ملنے کو میرا بے انتہا دل چاہتا ہے......"

جماعتِ اسلامی مہاراشٹر کے رُکن جناب عبدالرحمٰن صاحب کا میرے نام بمبئی سے جو خط (مورخہ ۴ اپریل) آیا ہے اُس میں صاحب موصوف نے لکھا ہے:

"ایک جانکاہ خبر سنانے جا رہا ہوں جس کے لیے نہ دل آمادہ ہے نہ قلم چل رہا ہے لیکن مشیتِ ایزدی کے آگے ہم بے بس ہیں، مولانا عامر عثمانی صاحب کا پرسوں شب میں پونہ میں انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

انجمن خیر الاسلام کے ایشیائی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے بمبئی تشریف لائے تھے، مشاعروں سے مرحوم کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن چونکہ آپ بھی شریک ہونے والے تھے لہٰذا آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کے پیشِ نظر گزشتہ ماہ جب وہ بمبئی تشریف لائے تو ہم لوگوں سے فرمایا تھا کہ اس ایشیائی مشاعرے میں انہیں مدعو کیا جائے تو اچھا ہے چنانچہ بڑی کوششوں کے بعد ان کو دعوت نامہ جا سکا، کسے معلوم تھا کہ یہ بلاوا اصلاً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہوا ہے، بندہ بیس روز قبل دل کا ایک دورہ پڑ چکا تھا۔ ۲۴ گھنٹے بے ہوش رہے اور ابھی صحت بمبئی کے سفر کی متحمل نہیں تھی، مگر آپ سے اور دیگر رفقاء سے ملاقات کے شوق میں چلے آئے، احتیاطاً اپنے برادرِ نسبتی کو ساتھ لے لیا تھا۔ ۱۱ اپریل کو صابو صدیق ٹکنک گراؤنڈ پر کلام بیٹھ کر سنایا، کچھ بدعتی حضرات نے ہوٹنگ

---

[1] مولانا عامر عثمانی مرحوم نے بچپن نہیں کہا ہوگا، وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے اور ان سے پہلی بار ملاقات کراچی میں پاکستان بننے کے تین چار برس بعد ہوئی تھی۔ (م۔ق)

کردی۔ اس کے بعد مرحوم اسٹیج سے اٹھ گئے، ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ نکل آئے۔
ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب نے ایک مشہور (CARDIOLOGIST)
کے نام چٹھی لکھ کر مجھے دی کہ دوسرے دن میں وہاں لے جاکر معائنہ وعلاج
کراؤں۔

لیکن دوسرے دن منتظمین مشاعرہ اصرار کرکے انہیں پونہ کے مشاعرے
میں لے گئے جہاں مرحوم نے کلام سنایا۔ خوب داد حاصل کی، کلام سناکر بیٹھے اور
برادرِ نسبتی کے زانو پر سر رکھ کر ابدی نیند سو گئے! ڈاکٹر نائک صاحب وہاں
موجود تھے فوراً کار میں لے کر بمبئی روانہ ہو گئے، یہاں سے ہم نے دیوبند
ٹرنک کال لگائی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، امیر جماعت اور مفتی عتیق الرحمن صاحب
کے مشورے سے بمبئی میں تدفین کردی گئی، مفتی صاحب ہمارے فون کے فوراً بعد
بذریعہ کار دیوبند تشریف لے گئے، ہم نے تو ہوائی جہاز کے ذریعہ میت بھیجنے
کے انتظامات کرلیے تھے لیکن مفتی صاحب کے مشورے کو ترجیح دی گئی۔

"مرحوم کو آپ سے خصوصی تعلق تھا: پچھلی بار بمبئی تشریف لائے تو بڑے شوق
سے آپ کا تذکرہ فرمارہے تھے۔ آپ کے اس مشورے کا بھی تذکرہ کیا جو آپ نے انہیں
شاعری نہ چھوڑنے کے سلسلہ میں دیا تھا۔ جماعت اسلامی کے تعلق سے پاکستان میں
آپ نے جس محاذ کو سنبھالا ہے۔ اس محاذ پر ہندوستان میں مرحوم جو لڑائی لڑ رہے
تھے۔ اس لحاظ سے جماعت کا بڑا نقصان ہوا۔ مرحوم کے قلم میں جو روانی، تیزی اور
منطقی انداز تھا وہ بے مثل ہے، اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے، ان کی حسنات
کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر......"

یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل وکرم ہے کہ مجھ جیسے معمولی حیثیت اور سطحی استعداد کے شخص کی
اتنے بڑے لوگوں کے دل میں اتنی محبت ڈال دی گئی ہے!

بعض اشعار اور ضرب الامثال رسمی طور پر لکھے پڑھے اور عالم کے لیے لکھ دیئے جاتے
ہیں مگر مولانا عامر عثمانی کی موت فی الحقیقت "موت العالِم موت العالَم" کی صحیح مصداق ہے،
اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۵ء)

مولانا عبدالباری ندوی

اب سے تقریباً ۵۵ برس پہلے اخبارات میں "مولانا عبدالباری" کا نام آتا تھا۔ تو پڑھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ یہ فرنگی محل کے شیخ الشیوخ مولانا عبدالباری ہیں۔ مولانا عبدالباری کے نام کے ساتھ "ندوی" کی نسبت سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا عبدالباری ندوی کے ناموں میں امتیاز ہوتا تھا! سیرت النبیؐ کی تیسری جلد میں "فلسفۂ جدیدہ اور معجزات" کے عنوان پر سو صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے اس حصہ کے ذریعہ راقم الحروف اُن سے متعارف ہوا اور فلسفہ کے ساتھ اُن کی دینی وابستگی کا اچھا نقش میرے لوحِ دل و دماغ پر ثبت ہو گیا۔

مولانا عبدالباری ندوی جامعہ عثمانیہ دکن میں فلسفہ کے استاد تھے، اُن سے حیدرآباد دکن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملاقات ہوتی رہتی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے اُن کا بڑا گہرا یارانہ تھا، اکثر و بیشتر موٹر کار میں جلسوں اور دعوتوں میں ان دونوں بزرگوں کو ایک ساتھ دیکھا گیا۔

ایک بار مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری غریب خانہ پر تشریف لائے اور مشہور صوفی بزرگ مولوی محمد حسین (ناظم سمتان و نیبرتی) کی مجلسِ وعظ و ارشاد میں مجھے لے گئے، راقم الحروف کو دیکھتے ہی مولوی محمد حسین نے فرمایا:

"ابھی کچھ نہیں..... بہت بڑا مرتبہ ہونا، بڑا رتبہ ہونا۔"

مولوی محمد حسین مرحوم نے گھنٹہ سوا گھنٹہ لاالٰہ الا اللہ کی تشریح فرمائی۔ وعظ کہتے میں وہ سیگرٹ پیتے جاتے تھے، تقریر خاصی دلنشین تھی، وہ دینی عالم نہ تھے مگر اپنے وعظ میں ایسے نازک نکتے بیان کرتے جو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی تصوف و اخلاق کی کتابوں میں نہیں ملتے! اُن کے معتقدین کا خیال تھا کہ انہیں "علم لدنی" عطا کیا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد یا تقسیم ہند سے کچھ قبل مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد دکن سے

پنشن لے کر لکھنؤ آ گئے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔

"فاران" نکلنا شروع ہوا تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا، "فاران" اُن کی خدمت میں اعزازی بھیجا جاتا، اپنے خطوں میں راقم الحروف کے مضامین کی تعریف بھی فرماتے، اپنی ہر کتاب "فاران" میں تبصرہ کے لیے بھیجتے، ان میں مشہور مغربی فلسفی "ہیوم" (HUME) پر بھی ایک کتاب تھی۔ پھر انہوں نے مغربی فلاسفہ پر لکھنا بند کر دیا۔ اپنے قابلِ احترام شیخ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر کئی کتابیں لکھیں، جن پر "فاران" میں مفصل تبصرہ آچکا ہے۔ "جامع المجددین" میں مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا تھانویؒ کی شخصیت تمام مجددین کی جامع ہے اور حضرت مولانا تھانویؒ نے تجدیدِ دین کا کارنامہ انجام دیا ہے! اُن کی تحریریں خشک ہوتی تھیں مگر علم و حکمت اور اخلاق سے لبریز! مولانا مرحوم نے فلسفہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے جو سعی کی ہے اس کا اجر اُنہیں آخرت میں ملے گا! اُن کی علمی شخصیت بلند پایہ تھی اور سیرت و کردار صالحیت کی روشن مثال!

برسوں اُن کے خط آتے رہے جن سے مودت و محبت اور ہم فکری کا اظہار ہوتا تھا مگر پھر خطوں میں طنز و تعریض کا رنگ بھی پیدا ہو گیا، سیاست کو وہ دنیا داری کا کام سمجھنے لگے اور جب وہ سیاسیات پر طنز کرتے تو جماعتِ اسلامی اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰؒ کی ذات پیشِ نظر ہوتی، یہ لَے پھر بڑھتی ہی چلی گئی، میں نے اپنے نیاز ناموں میں انہیں لکھا کہ سیاست کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور حکومت بھی دنیا داری کا کام نہیں ہے اب رہی گندی سیاست تو ——— جماعتِ اسلامی اس کی تطہیر کا فرض انجام دے رہی ہے۔

اب کئی برس سے خط و کتابت بند تھی، اُن کی آخری کتاب "مذہب اور سائنس" جو مکتبہ رشیدیہ (شاہ عالم مارکیٹ لاہور) نے شائع کی ہے، تقریباً ایک برس سے تبصرے کے لیے آئی ہوئی رکھی ہے اس پر "فاران" میں اِن شاء اللہ مفصل تبصرہ ہو گا۔

اس بات کو پندرہ سولہ برس ہوئے ہوں گے اُن کے صاحبزادے دفتر "فاران" میں اپنے والدِ محترم کے ایما پر مجھ سے ملے تھے، میں نے صاحبزادے سے کہا کہ مجھ سے

جو کچھ ہو سکتا ہے اُس کے لیے میں حاضر ہوں، پھر ان کی خیر خبر نہیں ملی کہ ہندوستان واپس چلے گئے یا پاکستان ہی میں موجود ہیں! خدا کرے جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں اور روزگار کی طرف سے مطمئن ہوں۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم ایک بار پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے علامہ سید سلیمان ندوی حیات تھے، اُنہی کے دولت کدے پر دعوت میں مولانا ندوی سے ملاقات ہوئی۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے چہرے سے، آنکھوں سے اور جبین و رخسار کی سلوٹوں سے ایسا لگتا تھا کہ شب بیدار ہیں اور وظائف داوراد سے خاص شغف رکھتے ہیں! دینداری اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، فلسفہ کے ساتھ خانقاہی ذوق، آب و آتش کا اجتماع تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات اور تعلیمات کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے آخری عمر میں صحت اچھی نہیں رہی تھی اور گراں گوش تو دہ برسوں سے تھے! اُن کی وفات کی خبر اخباروں میں پڑھی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۶ء)

